جدید سندھی ادب

• میلانات • رجحانات • امکانات

سیّد مظہر جمیل

اکادمی بازیافت

شہر میں پڑھتی ہے، دیکھا جاتا ہے اور یہ بات وڈیرے کی غیرت گوارا نہیں کرتی۔

یہ بھی صدیوں سے جاری بہیمیت کی کہانی ہے۔

''بھوکی''، ''کاؤنٹ ڈاؤن'' اور ''چائے سے خالی کپ'' (ترجمہ: پروفیسر فاروق مغل) مختلف نوعیت کی کہانیاں ہیں کہ ان میں احساس کی رَو کو متحرک کیا گیا ہے اور محض فضا آفرینی سے ماجرے کی تکمیل کی گئی ہے۔

''بیوٹی گرل'' محبت کی خوب صورت کہانی ہے جس میں جذباتی محبت اور انسانوں کے باہمی اختلاط سے پیدا ہوتے ہوئے احساس کی نغمگی بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح ''مریم'' (ترجمہ ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی) بھی محبت کی طلسماتی اثر رکھنے والی کہانی ہے جس میں ایک غریب اور بے سہارا لڑکی مریم جو رئیس کے گھر میں کام کاج کرتی ہے، 'مکھیا کوری' سے پیار کرنے لگتی ہے لیکن رئیس زبردستی اس کی شادی کہیں اور کر دیتا ہے مریم شوہر کو چھوڑ چھاڑ کر واپس آجاتی ہے اور پوری زندگی بغیر شادی کیے لوگوں کی خدمت کرنے میں گزار دیتی ہے۔ لوگ بڑھاپے میں بھی اسے 'مکھیا والی مریم'' کہہ کر پکارتے ہیں اور وہ اس بات پر خوش ہوتی ہے۔

ان کہانیوں میں قاضی خادم نے ہزار شیوہ زندگی کے نہ جانے کتنے رنگ کتنے روپ اور انداز دکھائے ہیں۔ اس کے ذخیرۂ فن میں نہ صرف موضوعات کا تنوع ہے بلکہ ہر کہانی ایک مختلف انداز نگارش کی امین بھی ہے۔

کلیم لاشاری ☆۱۲۹

کلیم لاشاری کی شخصیت کے کئی رُخ ہیں۔ ان کی شخصیت کا ایک معروف حوالہ محقق، مہم جُو اور ایکالوجسٹ کا بھی ہے۔ وہ اعلیٰ انتظامی عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں لیکن ان کی شخصیت کا خواہ کوئی بھی پہلو کیوں نہ رہا ہو، اس میں وہ ایک عوام دوست وابستگی کا بُوت فراہم کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے بہت زیادہ افسانے نہیں لکھے ہیں لیکن ان کے لکھے ہوئے افسانوں میں چند ایسے بھی ہیں جنھیں اپنے عہد کے جاری

رجحانات کا عکاس قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں انسان کے بنیادی وجودی مسئلے سے لے کر گرد و پیش بکھرے ہوئے سماجی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی مسائل سے نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''انیس سو تراسی (۱۹۸۳ء)، اب سے چار سال قبل شائع ہوا تھا۔ کلیم لاشاری نے مذکورہ مجموعے کے دیباچے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ادب کا مقصد خواہ حسن آفرینی ہی کیوں نہ ہو، اس کی اصل بنیاد اور اساس زندگی ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ زندگی کے متنوع موضوعات پر گفتگو کرنے کے لیے ہر شخص ہمہ وقت کمربستہ رہتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے حوالے سے نہ صرف حسن افروز باتیں کرنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں بلکہ عجب اور حیران کن باتیں منکشف ہوتی رہتی ہیں جن کے شعور و ادراک کے بغیر راہِ حیات کی منزلیں آسانی سے طے نہیں ہوسکتیں۔ تخلیقِ ادب کی بابت یہی وہ خیال ہے جو لکھنے والوں کو بالعموم سرشار رکھتا ہے اور یہ کہنا کہ کوئی ادیب محض توصیف و ستائش کے لیے لکھتا ہے، خام خیالی سے زیادہ نہیں۔ لفظوں کی فسوں کاری، مشاہدے کی ژرف نگاہی اور قوتِ اظہار میں جو باہمی ربط اور اختلاط ہے، وہ محض واہ واہ کے لیے نہیں ہوا کرتا، انسان کے تصورات ایسے ہی ہیں جیسے کسی دھندلے شیشے میں عکس ریز پرچھائیاں، ان میں سے کئی دیکھی بھالی ہوتی ہیں اور کئی اَن دیکھی، ادیب ان تمام خام تصورات کو زندگی کے تناظر میں متحرک تصویروں کی شکل دے دیتا ہے۔ وہ اپنی لفظی مصوری اور صورت گری میں مہارت کی داد نہیں چاہتا بلکہ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کے تخلیق کردہ فن پارے میں انسانی عمل کے محرکات، عوامل اور اثرات کو سمجھا جائے۔ اور اس طرح سماجی عمل کے بارے میں غور و فکر کی رسم چلے۔ ادب کے مقاصد کے بارے میں خواہ کتنی ہی خیال آرائیاں کی جائیں اور ادب کے مقام کی بابت کتنی ہی موشگافیاں ہوتی رہیں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ادب کسی نہ کسی انداز میں سماج و معاشرے پر اثرانداز ہوا کرتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے وہ معاشرتی حالات سے خود بھی متاثر ہوتا ہے بلکہ بعض بالغ نظر ناقدین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ادب نہ صرف سماجی کردار کا حامل ہوتا ہے بلکہ اس میں خاص خاص طبقات کی نمائندگی

کرنے کے رجحانات بھی کارفرما رہتے ہیں۔ کوئی خاص ادیب اپنے ادب میں (دانستہ یا غیر دانستہ طور پر) کسی خاص طبقے کی نمائندگی کرتا ہے اور کوئی دوسرا ادیب کسی دوسرے طبقے کا عکاس دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ ادب کے طبقاتی کردار سے بھی انکار ممکن نہیں۔''☆[۱۳۰]

مذکورہ بالا خیالات سے کلیم لاشاری کے فنی تصورات کا بخوبی اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

کلیم لاشاری وسیع المطالعہ اور عمیق مشاہدہ کے حامل فن کار ہیں۔ وہ اردگرد موجود مناظر ہی پر گہری نگاہ نہیں رکھتے بلکہ پس منظر محرکات وعوامل کو بھی دیکھ لینے پر قادر ہیں۔ معروضی حالات کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ معاشرتی تبدیلیوں کا جواز معاشرے میں موجودہ مادی عوامل میں تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے فن کا سب نمایاں حوالہ معاشرتی صورتِ حال سے ان کی وابستگی اور کمٹ منٹ ہے۔ وہ غیر مشروط سچائی کے ساتھ اپنے اردگرد اور آس پاس کی زندگی کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اس پیش کش میں ان تمام فنی لوازمات اور تخلیقی ضرورتوں کی مکمل پاس داری بھی کی جاتی ہے جو کسی واقعے اور کیفیت کو تخلیقی فن پارے میں منتقل کرتی ہیں۔ کلیم لاشاری کی کہانیوں میں سندھی قومیت کی خودشناسی وخود آگہی کے رجحان کو بھی خاص طور پر نمایاں مقام حاصل ہے۔

کلیم لاشاری کی معرکتہ الآرا کہانی ''مرسی کلنگ'' اس عوامی جدوجہد کی کہانی ہے جو فوجی استبداد کے خلاف اور جمہوری حقوق کے سلسلے میں چلی تھی، یہ دراصل سندھ کے عوام کی خود آگہی خودشناسی کی تحریک تھی جس کے دوران سندھ کے عوام بالخصوص نوجوان نسل غیر انسانی ظلم و استبداد کا مسلسل نشانہ بنائی گئی ہے۔ کلیم لاشاری نے اپنی اس کہانی میں ان دردناک چیخوں اور کرب ناک سسکیوں کو محفوظ کرلیا ہے جو ظلم و استبداد کے شکار عوام کے دلوں سے بلند ہوئی تھی۔

''مرسی کلنگ'' (ترجمہ: شاہد حنائی) کا راوی خود ایک بیوروکریٹ ہے جو چیف منسٹر صاحب کے ساتھ تعینات ہے اور جس کی ڈیوٹی ہے کہ وہ چیف منسٹر کی مصروفیت کے پروگرام مرتب کرے اور ضرورت مند لوگوں کو ان سے ملوائے، سرکٹ ہاؤس میں

منسٹر صاحب سے ملنے والوں کا اژدہام ہے، ان ہی لوگوں میں ایک بوڑھا، غریب، دیہاتی بھی ملاقات کا خواست گار ہوتا ہے لیکن ایسے موقعے پر بے سہارا لوگوں کا جو حشر ہوتا ہے، اسی طرح اسے بھی مسلسل دھتکارا جاتا ہے۔ آخر افسانے کے راوی کو نہ معلوم کیوں بوڑھے پر ترس آجاتا ہے اور وہ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی درخواست کو لے کر دیکھتا ہے جو دراصل چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے نام لکھی گئی ایک اپیل تھی جس میں درخواست کی گئی تھی کہ اس کے نوجوان بیٹے کو عوامی تحریک کے دوران موت کی سزا سنائی جاچکی ہے اور وہ اب اپنے بیٹے کے لیے رحم کی درخواست داخل کرنا چاہتا ہے۔ درخواست چیف منسٹر تک پہنچادی جاتی ہے لیکن چند ماہ بعد جب کہ راوی کسی اور سلسلے میں ایک اسپتال میں ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو وہ وہاں اس بوڑھے اور اس کی بوڑھی عورت کو دیکھتا ہے۔ بوڑھی عورت سکتے کے عالم میں ہے کہ ان کے لڑکے کو پھانسی ہوچکی ہے اور یہ بات اس بوڑھی عورت سے چھپائی جاتی ہے اور اب وہ ایک مسلسل انتظار کے عذاب میں مبتلا ہے۔

دونوں ماں باپ غم و اندوہ سے زندہ لاشوں میں تبدیل ہوگئے ہیں اور ان کی ذہنی کیفیت اس حد تک دردناک بن چکی ہے کہ کہانی کا راوی انھیں روز روز کے دکھ اور تکلیف کے مسلسل آزار سے نجات دلانے کے لیے انھیں اپنی گاڑی کے نیچے دبا کر ختم کردیتا ہے کہ اس طرح ختم کرکے ہی انھیں مسلسل غم الم کی شدت سے نجات دلایا جاسکتا تھا۔

کلیم لاشاری کی مذکورہ کہانی انتہائی شدید تاثر کی کہانی ہے۔ اگرچہ اس کے اختتامیہ میں کسی قدر میلوڈرامیٹک فضا بھی پیدا ہوگئی ہے لیکن جبر و استبداد کے ہاتھوں انسان کی مکمل شکستگی کی کیفیت بذاتِ خود انتہائی درجے پر پہنچی ہوئی ہوتی ہے اور اس احساس کی شدت کو محسوس کرنے کے لیے ایسے ہی شدید اختتامیے کی ضرورت بھی تھی۔☆[۱۳۱]

''عوام'' کلیم لاشاری کی ایک اور کہانی ہے جسے شاہد حنائی نے اردو میں منتقل کیا ہے جس میں سندھ کے وڈیروں، زمیں داروں اور ثروت مند طبقے کی غیرانسانی بربریت اور سفاکی کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ یہ سندھ کے وڈیرے بالعموم قیمتی کتے پالتے

ہیں اور مبالغے کی حد تک ان کی ناز برداریاں کرتے ہیں اور آخر میں ان پالتو کتوں کو ان سے بھی زیادہ مہلک اور خوں خوار جانور ریچھ سے لڑواتے ہیں اور اس لڑائی میں عام طور پر کتے جان سے مارے جاتے ہیں کیونکہ ریچھ کتوں سے زیادہ قوی، طاقتور اور زیادہ خوں خوار جانور ہوتا ہے۔ اس خوں ریزی اور ہلاکت آفرینی سے ایک کھیل کی طرح لطف اٹھایا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی بربریت کا یہ منظر ایک عام بازاری کتے میں خوں خوار ریچھ کے خلاف اتنے غصہ اور انتقام کی کیفیت پیدا کردیتا ہے کہ وہ پالتو کتوں کے زخمی ہوجانے کے بعد ریچھ پر از خود حملہ کردیتا ہے اور اس کے حملے کی شدت ریچھ جیسے لحیم شحیم اور خوں خوار جانور کو پسپائیت پر مجبور کردیتی ہے۔ کلیم لاشاری نے اس پورے منظر کو نہایت چابک دستی سے پینٹ کیا ہے اور صرف کہانی کے ایک آخری جملے سے کہانی میں معنی کے تاثر کو کمال تک پہنچا دیا ہے۔

کلیم لاشاری کی مذکورہ کہانی میں علامت اور اشاریت کی بھی ایک سطح موجود ہے جس کا اطلاق سماجی و معاشرتی حالت پر بھی کیا جاسکتا ہے کہ معاشرے میں جبر و استبداد اور خوں آشام مناظر عام لوگوں میں بھی غصے اور نفرت کی ایسی لہر پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں جو بالآخر انتقام کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔

اسی طرح کلیم لاشاری کی کہانی ''انیس سو تراسی (۱۹۸۳ء) جس پر انھوں نے اپنے مجموعے کا نام بھی رکھا ہے) سندھ کی قومی تحریک کی خوں چکاں داستاں سناتی ہے۔ یہ ایک طویل کہانی جس میں سندھی معاشرے میں سیاسی، معاشی اور تہذیبی استحصال و استبداد کے خلاف تحریک کے دوران پیدا ہونے والا جذباتی تموج اپنے عروج پر ہے اور سندھ کے طول عرض میں شہر شہر، گاؤں گاؤں اور محلے محلے میں ایسے مناظر عام طور پر دکھائے گئے ہیں جن میں استبدادی قوتیں اور ان کے خلاف مزاحمت کرنے والی قوم پرست قوتیں دوبدو نظر آتی ہیں۔ کہانی کا راوی لطیف، خود ایک بیوروکریٹ ہے جو کار کے ذریعے اندرونِ سندھ سفر کر رہا ہے کہ راستے میں اسے ایک پردیسی نما نوجوان مل جاتا ہے، جس نے سندھی لباس پہنا ہے لیکن جس کا رنگ و روپ گورا چٹا اور مغربی انداز کا

ہے، اس نوجوان کا نام علی ہے اور وہ ایک سندھی نژاد باپ کا بیٹا ہے جو بہت مدت قبل برطانیہ میں آباد ہوجاتا ہے لیکن جس نے اپنے لڑکے کو سندھی زبان و ثقافت سے آشنا رکھا ہے اور اب وہ تعلیم سے فارغ ہوکر سندھ کی سیر کرنے آیا ہے وہ چوکنڈی کے قبرستان دیکھتا ہے اور اپنے ثقافتی ورثے سے فخر و انبساط کے جذبات حاصل کرتا ہے۔ کہانی کا راوی اسے لے کر سندھ کے مختلف شہروں میں گھومتا ہے، اس وقت سندھ میں موجود سیاسی معاشرتی و تہذیبی صورتِ حال کے مناظر کہانی میں پیش کیے جاتے ہیں جن سے اس نوجوان پر منکشف ہوتا ہے کہ سندھ کے عوام ایک قومی جدوجہد اور تحریک سے گزر رہے ہیں جن کے دوران انھیں قدم قدم پر جبر و استبداد کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ سندھ کی معاشرتی صورتِ حال جو مزید ہلچل اور ارتعاش سے گزر رہی ہے۔ یہ صورتِ حال علی کے خون میں بھی قومی جذبے اور جوش کی لہریں پیدا کردیتی ہے اور وہ بھی ایک جلوس میں شامل ہوکر پولیس اور فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے شدید زخمی ہوجاتا ہے اور زندگی و موت کی کش مکش سے گزرتا ہے۔ اس کی جان بچانے کے لیے فوری طبّی امداد کی ضرورت ہے۔ لیکن تمام راستے پولیس اور فوج نے بند کردیے ہیں، لطیف اپنی سرکاری حیثیت کے باوجود فوری طبّی امداد حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے حتیٰ کہ اسے علی کو قریبی اسپتال لے جانے تک کے لیے ایمبولینس دستیاب نہیں ہو پاتی اور آخر لطیف کسی کی مدد سے علی کو اپنی گاڑی میں ڈال کر قریب ترین شہر لاڑکانہ پہنچنے کی کوشش کرتا ہے، اس وقت علی کی زندگی بچانا ہی لطیف کا سب سے بڑا مشن قرار پاتا ہے اور وہ جلد از جلد فساد زدہ علاقے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر جگہ جگہ اسے روک ٹوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس میں کافی وقت صرف ہوجاتا ہے اور علی کی حالت لحہ بہ لحہ خراب سے خراب تر ہوتی چلی جاتی ہے لیکن وہ اپنے اوسان بحال رکھتا ہے اور علی بھی اپنی تکلیفوں پر قابو پانے کی کوششیں جاری رکھتا ہے لیکن ایک مقام ایسا آتا ہے جب علی کی حالت مکمل طور پر بے قابو ہوچکی ہے اور لطیف امید و یاس کے دوراہے پر کھڑا ہوا ہے۔ علی گاڑی رکواتا ہے وہ مرنے سے پہلے اپنی پیاری دھرتی پر لیٹنا چاہتا ہے۔ لطیف کوشش کر کے اسے گاڑی سے اتارتا ہے

اور علی زخموں کی تاب نہ لا کر آخر مر جاتا ہے۔

واقعاتی سطح پر اس کہانی کا کینوس خاصا وسیع ہے اور اس میں پورا سندھ آتش و آہن کے دہکتے ہوئے عذاب سے گزرتا دکھائی دیتا ہے۔ بے شک کہانی میں واقعات کو زیادہ اہمیت نہیں ہے کہ کلیم لاشاری نے واقعات کی جھلکیاں دکھا کر اس مجموعی فضا کو مصور کیا ہے جن سے کہانی کے کردار اور اردگرد بھی انسان نبرد آزما ہو رہے ہوتے ہیں۔ کہانی میں جہاں جذباتی رو موج زن رہی ہے۔ وہیں واقعات وعوامل اور حالات ونتائج پر تجزیاتی تبصرہ بھی کرداروں کی گفتگو کے دوران آگئے ہیں جن سے منظر اور پس منظر روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ کہانی اپنے موضوع کے اعتبار سے بلند آہنگ (Loud) نہ ہوجائے اور اس کی فنی و تخلیقی پیش کش پر سطحی جذباتیت اور سیاسی نعرے زنی نہ حاوی ہوجائے لیکن کلیم لاشاری نے نہایت احتیاط اور فنی در و بست کے ساتھ ایک ایسا تخلیقی بیانیہ تشکیل دیا ہے جس نے اس کہانی کو سندھی زبان کے مزاحمتی ادب کا نہایت وقیع واہم حصہ بنا دیا ہے۔

''ویڑھ'' (مقابلہ) میں دکھایا گیا ہے کہ باکسنگ کے مقابلے میں لوگ جس جوش وخروش کا اظہار کرتے ہیں اور اس میں ایک باکسر کے ہاتھوں دوسرے باکسر کا جو خوف ناک حشر ہوتا ہے اور اسے دیکھ کر تماش بین لطف ومسرت کے جن احساسات سے دوچار ہوتے ہیں، وہ مناظر ان کے کن جذبات کی تسکین کرتے ہیں۔ اور اس قسم کے نام نہاد چیمپین شپ مقابلوں میں شریک کھلاڑیوں کے اصل سماجی و معاشی مسائل کیا ہوا کرتے ہیں۔ غالباً اس موضوع پر یہ اپنی قسم کی واحد کہانی ہے۔

اسی طرح ''سزا'' میں ایک مختلف تہذیبی فضا پینٹ کی گئی ہے جو رنگین بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔ اس کہانی میں سندھ کے میلوں، ٹھیلوں اور زیارتوں پر واقع ہونے والی تفریحی مشاغل کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کہانی میں سندھ کی ثقافت کے مختلف shades اس طرح آپس میں گڈمڈ ہوئے ہیں کہ ان سے ایک خوب صورت موزائیک پیٹرن ابھرتا

ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لوگ اپنے محدود سے محدود مسائل کے باوجود جس وفورِ جذبات کے ساتھ کرتے ہیں، بلاتخصیص مذہب ان میلوں میں شرکت کرتے ہیں، وہ سندھی معاشرت کا ایک انوکھا اور دل کش پہلو ہے۔ سیہون شریف کا میلہ ہو کہ 'لاہوت لامکاں' کی زیارت، عام سندھی اپنے عقائد سے قطع نظر ان سب مشاغل میں دل و جان سے شریک ہوتا ہے اور ان سب میلوں ٹھیلوں سے کسی نہ کسی قسم کی مذہبی عقیدت مندانہ روایت وابستہ ہوا کرتی ہے جو دراصل لوگوں کے جذبہ و احساس میں فراوانی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے لیکن ان میلوں اور تفریح گاہوں میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ اس میں کھیل تماشے بھی ہوتے ہیں اور نام نہاد حسن کے بازار بھی لگتے ہیں جہاں سے ہلاکت آفریں بیماریوں کی سوغاتیں تقسیم ہوتی ہیں۔

کلیم لاشاری نے اس کہانی میں بین السطور جو کچھ بھی کہنا چاہا ہو، وہ ایک علاحدہ قدر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان سب سے ماورا میرے نزدیک اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی اور خوب صورتی یہ ہے کہ اس میں سندھی معاشرت کے ایک اہم گوشے کی متحرک تصویریں پیش کردی گئی ہیں اور ایک ہی کہانی میں سندھی ثقافت کے گوناگوں عکس و رنگ محفوظ ہوگئے ہیں جو ایک اچھے فن پارے کا بنیادی منصب بھی ہوا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا کہانیوں کا مطالعہ اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ کلیم لاشاری کا فن کدہ ہر چند مختصر سہی لیکن اس میں قرار واقعی تنوع اور رنگارنگی موجود ہے۔

۱۳۲☆ قمر شہباز

قمر شہباز کا شمار ان ترقی پسند، روشن خیال اور قوم پرست ادیبوں میں ہوتا ہے جو ادب کے سماجی کردار کی بابت کسی قسم کے تردّد میں گرفتار نہیں ہوتے ہیں اور ادب کو سماجی تنقید اور تعمیر کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ ایک خوش فکر اور صاحبِ طرز شاعر بھی ہیں۔ چنانچہ ان کی تخلیقی سرگرمیاں نظم اور نثر دونوں محاذوں پر جاری رہی ہیں۔ وہ کہانی نگار کے علاوہ ایک مقبول اور پسندیدہ تمثیل نگار بھی ہیں اور ریڈیو اور ٹیلی وژن سے ان کے لکھے